احسان و تصوّف

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ

دین کا ایک اہم شعبہ جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے وہ ہے جسے حدیث نبوی میں لفظِ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور عرف عام میں اسی کو تصوّف بھی کہا جاتا ہے۔ جس کی حقیقت مختصر اور عام فہم لفظوں میں یوں بیان کی جا سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندے کے قلب کو ایسا اطمینان و یقین نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدے سے ہو جایا کرتا ہے۔ (جس کے بعد اس کے خلاف کسی وہم اور وسوسے کی بھی گنجائش نہیں رہتی) پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے قلب ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت اور عظمت سے معمور رہے اور پھر اس بندے کی عبادت، اس کے اخلاق، اس کی معاشرت اور اس کے سارے معاملات یعنی اس کی پوری زندگی کی روح، یہی ایمان و یقین اور یہی رابطۂ عبدیت بن جائے۔ پھر وہ جو کچھ کرے اسی ایمان اور رابطۂ عبدیت کے داعیہ سے کرے اور اس طرح اس کی ظاہری زندگی بھی اسی باطنی رنگ میں رنگ جائے۔ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ط

احسان (تصوف) کی یہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ سمجھ سکتا ہے کہ یہ رنگ یا کیفیت عینِ کمال دین و ایمان ہے اور جس کو یہ دولت جتنی نصیب ہو اتنا ہی اس کا دین کامل ہے اور جس میں اس لحاظ سے جتنی کمی ہو اتنی ہی اس کے کمال دین میں کمی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث جو حدیث جبرئیل نام سے معروف ہے۔ اور جس میں سوال و جواب کے پیرایہ میں صحابۂ کرامؓ کو بالاجمال گویا پورے دین کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں اسلام اور ایمان کے بعد جس طرح احسان کا ذکر کیا گیا ہے اس سے احسان کی حقیقت معلوم ہو جانے کے ساتھ یہ اشارہ بھی مل جاتا ہے کہ اسلام و ایمان کی تکمیل، مقام احسان ہی سے ہوتی ہے اور وہی دین کی تکمیل کا آخری عنصر ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیلؑ ایک نو وارد اجنبی کی شکل میں آئے اور حضورؐ کے بالکل قریب آکر بیٹھ گئے اور آپؐ سے پوچھا کہ بتایئے ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے اس کا جواب دیا۔ پھر پوچھا بتایئے اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے اس کا بھی جواب دیا۔ اس کے بعد تیسرا سوال یہ کیا کہ بتایئے کہ احسان کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا۔

"اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ"

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت ممکن نہ ہو تو پھر اس طرح عبادت کرے گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ مقامِ احسان یہ ہے کہ بندے کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب ملحوظ رکھے گویا اللہ تعالیٰ اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے کیونکہ بندہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو واقعتہً نہیں دیکھتا بلکہ اس دنیا میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور وہ بندے کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ لہٰذا بندے کو ہر وقت اور ہر کام میں اس کا ایسا ہی ادب اور لحاظ کرنا چاہیئے گویا اللہ تعالیٰ اس کی نگاہ کے سامنے ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب بندے کو حقیقتِ یقین نصیب ہو جائے۔ اور وہ اس کے قلب پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اس کے سامنے رہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْ اَرَاکَ اَبَدًا حَتّٰی اَلْقَاکَ ط

اے اللہ! میری یہ حالت کر دے کہ میں تجھ سے ایسا ڈروں اور تیرا ایسا ادب کروں گویا تجھے ہر وقت دیکھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں تجھ سے جا ملوں۔

حضور، یادداشت اور نسبت احسانی کیفیت ہی کی مختلف تعبیریں ہیں

اسی حالت و کیفیت کو حضرات صوفیہ "حضور" یا "یادداشت" سے تعبیر کر دیتے ہیں اور اسی کو "نسبت" بھی کہا جاتا ہے۔ کسی بندے کے صاحب نسبت ہونے کا مطلب ان حضرات کی اصطلاح میں یہی ہوتا ہے کہ اس کو یہ دولت کسی قابل لحاظ درجہ میں نصیب ہے۔

یہ کیفیت اور یہ نسبت جب کسی بندے کو کامل درجہ میں نصیب ہو جاتی ہے تو پھر اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اللہ سے غافل ہونا بھی چاہے تو غافل نہیں ہو سکتا۔ اور وساوس و خطرات سے ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ یا وسوسہ قلب میں لانا بھی چاہے تو نہیں لا سکتا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی رح غالباً اپنا ہی یہ حال اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلۂ عالیہ (نقشبندیہ) سے مخلصانہ تعلق رکھنے والے ایک درویش حکم خداوندی "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ" (اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کر) کے مطابق اپنا یہ حال بیان کرتے ہیں کہ خطرے اور وسوسے دل سے اس قدر ناپید ہو گئے ہیں کہ اگر بالغرض حضرت نوح کی سی لمبی عمر مل جائے تو تقریباً ایک ہزار سال کی اس طویل مدت میں ایک وسوسہ بھی دل میں نہیں آئے گا، بلکہ اگر کسی خطرے یا وسوسے کے دل میں لانے کی کوشش بھی کی جائے گی جب بھی کوئی وسوسہ نہیں آ سکے گا" (دفتر اول مکتوب ۵۶)

پھر اس نورِ یقین، اس حضوری نسبت اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلہ میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں اور پھر اس شخص کے تمام ظاہری اور باطنی اعمال مثلاً دوستی، دشمنی، کسی سے ملنا اور کسی

سے نہ ملنا، کسی کو کچھ دینا اور کسی سے کچھ لینا، کھانا، پینا، سونا اور جاگنا سب اللہ ہی کے لئے ہونے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقامِ اخلاص ہے۔ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ"

جس نے اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے دشمنی کی، اللہ ہی کے لئے کسی کو کچھ دیا اور اللہ ہی کے لئے کسی کو دینے سے ہاتھ روکا تو یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔ (ابوداؤد)

اس دولتِ عظمیٰ کا اعلیٰ ترین درجہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تھا اور اسی کی وجہ سے علم و معرفت اور تقویٰ و خشیت میں بھی سب سے بلند مقام آپؐ ہی کا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد بھی فرمایا:۔

اِنَّ اَتْقَاکُمْ وَاَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ اَنَا (صحیح بخاری باب الایمان)

"میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا ادب و لحاظ کرنے والا ہوں اور اللہ سے متعلق علم و یقین میں بھی سب سے زیادہ حصہ میرا ہی ہے"

پھر آپؐ کے فیضِ صحبت سے یہ دولت اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے احوال کے مطابق صحابۂ کرامؓ کو بھی بالعموم حاصل تھی اور انہی کی اتباع کی بدولت ہر دور کے اولیاء اللہ کا خاص سرمایہ بھی یہی دولت رہی ہے یعنی یہ نورِ یقین اور اس سے پیدا ہونے والا رابطۂ عبدیت اور کیفیتِ خشیت و محبت۔ واضح ہو کہ تصوف کے سارے اشغال و اذکار اور ریاضات و مجاہدات کا مقصد و منتہیٰ یہی ہے۔

چنانچہ ہمارے دور کے عالمِ ربانی اور محقق صوفی قطبِ ارشاد حضرت مولانا گنگوہی خلیفۂ اعظم شیخ العرب والعجم حضرت سیدی و مولائی حاجی امداد اللہ صاحب چشتی صابری مہاجر مکی (نور اللہ مرقدہ) اپنے ایک مکتوب میں اسی نورِ یقین کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

"یہ انتہا سب طریقوں کی ہے (مثلاً چشتی، قادری، سہروردی اور نقشبندی) ....

صحابۂ کرامؓ نے اپنا تمام اثاثہ اور سامان اور آبرو اور جان کیوں دی تھی؟ کیا دیکھا تھا؟ بس! نہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے یقینِ کامل حاصل ہو گیا تھا اور اسی پر سب کاموں کا مدار تھا۔ حضرت سیدی شیخ عبدالقادر جیلانی رح، خواجہ خواجگان معین الدین چشتی رح، اور سید الطائفہ بہاؤالدین بخاری کیوں بڑے ہو گئے؟ اسی یقین کی بدولت بڑے ہو گئے"

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں" اسی نسبت کا دوسرا نام احسان ہے کہ بعثت جناب فخر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی، اسی کے لئے تھی۔ جملہ صحابہؓ اس نسبت کے حامل تھے۔ علی حسب مراتبہم (اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق) پھر اولیائے امت نے اسی نسبت کو دوسرے طریقوں سے پیدا کیا"۔ (مکاتیب رشیدیہ ص۱۴)

الغرض اس باب میں اصل چیز اسی نورِ یقین اور اسی احسانی کیفیت کی تحصیل ہے اور جیسا کہ معلوم ہوا صحابۂ کرامؓ کو یہ نعمت، کامل عقیدت اور محبت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی ہدایت کے

مطابق اعمالِ خیر کی مشغولیت اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے حاصل ہوئی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اجتماعی طور سے صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت اس باب میں گویا آپؐ کی قائم مقام تھی اور ایمان اعمالِ صالحہ اور عقیدت و محبت کے ساتھ ان حضرات کی صحبت و رفاقت اس مقصد کے وصول کے لیئے کافی تھی۔

نسبتِ احسانی پیدا کرنے کے لئے طریقۂ صوفیہ کا آغاز

پھر اس کے بعد جب صحابہ کرامؓ بھی دنیا میں نہ رہے اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ میں خیر کی مقدار گھٹنے اور شر کی مقدار بڑھنے لگی تو ایک وقت آیا کہ امت کے ایسے افراد نے جو اس دور میں اس احسانی نسبت کے خاص وارث اور امین تھے اور جن کو اس شعبہ میں تخصص اور حذاقت کا وہی مقام حاصل تھا۔ جو فقہ میں ائمہ مجتہدین کو حاصل تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اب دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی مؤثر صحبتیں بھی موجود نہیں ہیں اور اسلامی معاشرے میں بھی، سابق کے مقابلہ میں خیر بہت کم اور شر بہت زیادہ ہو گیا ہے، مسلمانوں کے دلوں میں نورِ یقین اور احسانی کیفیت اور اللہ کی خشیت اور محبت پیدا کرنے کے لئے بطورِ تدبیر کچھ ایسے اعمال و اشغال و اذکار تجویز کئے جن کو انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس احسانی نسبت کے حصول میں مفید اور معاون سمجھا مثلاً کثرتِ ذکر، کثرتِ نوافل، مراقبہ اور مجاہدۂ نفس وغیرہ۔

جن کا اس مقصد کے حصول میں مفید اور معاون ہونا عقلی طور پر بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور ان کی اس خصوصیت، خاصیت اور تاثیر پر نصوصِ قرآنی میں واضح اشارات بھی ملتے ہیں۔ اور پھر جمہورِ امت کی قبولیت اور تجربہ کی کامیابی نے ان بزرگوں کی اصابتِ رائے اور صحتِ طریق پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

ہزار سال سے زیادہ کا تجربہ اور صلحائے امت کا اتفاق

تقریباً ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے اُمتِ محمدیہ کے صالح ترین طبقہ نے اس حقیقت پر اتفاق کیا ہے کہ نورِ یقین اور رابطہ مع اللہ یعنی نسبتِ احسانی پیدا کرنے کے لئے صوفیائے کرامؒ کا یہ طریقہ جسے عرفِ عام میں سلوک یا طریقت کہتے ہیں، اصولاً اور عقلاً درست اور نتیجۃً کامیاب ہے۔ آخر اس حقیقت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ مشاہیر اولیائے امت مثلاً حضرات معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، سری سقطیؒ، شقیق بلخیؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، ابو بکر شبلیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ احمد رفاعیؒ، شیخ ابوالحسن شاذلیؒ، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الدین گنج شکر اجودھنیؒ، محبوبِ الٰہی سلطان نظام الدین اولیاءؒ، شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ، مخدوم صابر کلیریؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، شاہ فخر الدینؒ، شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ اور ان جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اس نسبت کے حامل بلکہ اس راہ کے امام اور داعی ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک بزرگ کی صحبت سے اللہ کے لاکھوں بندوں کو یہ دولتِ کبریٰ اور نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوئی ہے۔

جو شخص ان سلسلوں سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہؤا وہ اسی راہ سے حاصل ہؤا۔ جسے تصوف کہتے ہیں ـــ پس جس طریقہ نے امتِ محمدیہ میں اتنے کاملین اور اس قدر اصحاب احسان و یقین پیدا کئے ہوں جن کو بجا طور سے اس امت کا گل سرسبد (ٹوکری میں سب سے بڑا پھول) کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقے کے صحیح اور کامیاب اور مقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؛

اغلاط تصوف اور ان کی اصلاح

ہاں جس طرح دین کے دوسرے شعبوں میں، عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی، امت کے بعض حلقوں سے چھوٹی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کا شعبہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح علمائے ربانی اور مجددین امت کے ذریعہ عقائد و اعمال کی اصلاح ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح اس شعبۂ احسان و تصوف کے سلسلہ کی اغلاط کی اصلاح بھی منجانب اللہ محققین صوفیہ کے ذریعہ برابر ہوتی رہی ہے۔ خاص کر ان آخری تین چار صدیوں میں تصوف کی اصلاح اور تجدید کا جو کام ہندوستان میں ہؤا ہے وہ تو دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ مثلاً امام ربانی مجدد الف ثانی رح اور ان کے فرزند اور جانشین خواجہ محمد معصوم رح کے مکتوبات کے ضخیم دفتر، شاہ ولی اللہ رح اور ان کے شاگرد رشید حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، شاہ محمد اسمٰعیل شہید رح کا مرتب کیا ہؤا۔ حضرت سید احمد صاحب شہید رح کے ملفوظات و افادات کا مجموعہ (صراط مستقیم) پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہی رح کے رسائل و مکاتیب اور سب سے آخر میں حکیم الامۃ حضرت تھانوی رح کا تصنیف کردہ اس سلسلہ کا پورا ایک کتب خانہ!

ان حضرات کی کوششوں اور اصلاح نے تصوف کو اتنا صاف، روشن اور بے غل و غش کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔

پس جس طرح کسی مسلمان کے لئے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد اور نظام اعمال میں بعض افراد کی غلط روی سے غیر مطمئن ہو کر عقائد و اعمال کی فکر سے بے نیاز ہو جائے یا انہیں ترک کر دے، اسی طرح کسی مسلمان کے لئے یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ سلوک اور تصوف میں بعض لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ ہی سے بے نیاز ہو جائے جس کے بغیر کسی مسلمان کا دین کامل نہیں ہوتا اور اسے حلاوتِ ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے ناظرین کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ دین میں احسان کا کیا مقام ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے اور یہ بھی کہ طالبوں کے لئے اس مقام تک پہنچنے کی عام شاہراہ وہی ہے جسے عرف عام میں سلوک و طریق کہتے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ اس فن کے ائمہ اور ماہرین سب اس پر متفق ہیں کہ اس راہ کو طے کرنے کے لئے کسی راہنما کی رہنمائی ضروری ہے، یعنی جس طرح کوئی شخص صرف طب کی کتابیں پڑھ کر اپنی اور دوسروں کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو اس کا یہ فعل سراسر غلط اور خطرناک ہے۔ اسی طرح اس روحانی معالجہ

میں بھی کسی ایسے روحانی طبیب سے استفادہ اور اس کی ہدایات پر عمل اور اس کی تجاویز کا اتباع ضروری ہے۔ جو خود اس طریقہ پر چل کر احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ پیدا کر چکا ہو اور اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو۔ اس لئے طالب کا پہلا قدم اور پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے کسی صاحب نسبت اور صاحب ارشاد بندے کا انتخاب کرے اور اس سے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔ اسی کا نام ارادت ہے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسے صاحبان نسبت حضرات کی روز بروز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن الحمدللہ! دنیا ابھی اللہ والوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ کے ایسے بندے اب بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اپنے محدود بشری علم و اندازے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے اس زمانہ میں دولت نسبت کے وارث اور امین ہیں اور ان کی رہنمائی میں چلنے والے اور محنت و مجاہدہ کرنے والے مخلص طالب انشاءاللہ محروم نہیں رہیں گے۔

اللہ والوں کی پہچان

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص بھی کہیں پیر بنا بیٹھا ہے۔ وہ اس راہ کی رہنمائی کا اہل بھی ہے۔ اس صورتِ حال سے کون ناواقف ہے کہ آج کل جس طرح عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص اور کامل اور اصلی و نقلی سب طرح کے ہیں۔ اسی طرح پیروں میں بھی سب طرح کے ہیں۔ بلکہ واقع یہ ہے کہ یہاں نقل، اصل سے بہت زیادہ ہے لیکن جس طرح دوسرے شعبوں میں اصلی اور نقلی کو پہچانا جا سکتا ہے اسی طرح تصوف کے شعبہ میں بھی اہلوں اور نااہلوں کا پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس راہ کے محققین نے جو علم شریعت کے بھی ماہر ہیں مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ نے کتاب و سنت کے ارشادات اور اپنی دینی فہم و فراست اور اس کے راہ کے تجربہ سے اللہ کی صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھ دی ہیں جن سے اصحاب نسبت و ارشاد کو باسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی اللہ کے ان پاک بندوں کی یہ ہے کہ تقویٰ اور اتباع شریعت کے اعتبار سے ان کی کیفیت یہ ہو کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے سے خدا یاد آتا ہو، دنیا کی محبت (جو تمام گناہوں کی جڑ ہے) کم ہوتی ہو اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں چلنے والوں میں یہ خوبیاں صاف نظر آتی ہوں۔

پس طالب حق کو لازم ہے کہ اللہ کے کسی ایسے بندے کو یا تو خود تلاش کرے یا اگر دوسرے ثقہ اور اصحاب نظر حضرات کے بتلانے سے کسی بزرگ کے متعلق اس بارے میں اطمینان ہو جائے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ اطمینان اور بڑھے تو پھر دلجمعی کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرے اور ان سے رہنمائی کا طالب ہو اور پھر ان کی تجاویز و ہدایات کی اسی طرح پیروی اور پابندی کرے جس طرح ایک جسمانی مریض اپنے معالج کے نسخہ اور ہدایات کی پابندی کرتا ہے۔

اگر ایسا کیا گیا تو انشاءاللہ محرومی نہیں رہے گی اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس احسانی کیفیت کا کچھ حصہ ضرور عطا فرمائے گا۔ جس سے دین و ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور جس کی بدولت ایمان بالغیب، ایمان بالشہود کی مانند ہو کر ہر قسم کے شکوک اور شبہات سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جس کے نتیجہ میں پوری زندگی، احسانی زندگی بن جاتی ہے۔